ڈاکٹر فرمان فتح پوری

یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

اشفاق حسین نئی نسل کے ان شاعروں اور ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے آزادی کے وقت یعنی ۱۹۴۷ء سے ایک آدھ سال پہلے یا بعد آنکھ کھولی ہے۔ تہذیبی زندگی کے حوالے سے اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ صنعتی اور سائنسی ترقی کے اس عہد کے زائیدہ و پروردہ ہیں جس کا آغاز 'ہیروشما' کے دھماکے کے بعد سے ہوتا ہے اور جس کے نقطۂ انجام کے لیے دنیا بڑی بے چینی اور اضطراب کے ساتھ انتظار کر رہی ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ سیاسی اور سماجی اعتبار سے بھی اس نسل کو جس ماحول میں جینا پڑا، وہ بھی اپنے اثرات کے لحاظ سے صنعت و سائنس کی لائی ہوئی تباہی اور ہلچل سے کسی طرح کم نہ تھا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان وجود میں آیا یعنی جنوبی ایشیا کی ایک بڑی آبادی نے صدیوں کی غلامی سے نجات پائی، چونکہ یہ نجات آزادی کی طویل جنگ کے بعد نصیب ہوئی، اس لئے زندگی کی نئی امنگوں اور تازہ امکانات کی ایک نشاط انگیز لہر بھی اپنے ساتھ لے آئی۔ اپنی زمین، اپنے وطن، اپنے دیار، اپنے پہاڑ، اپنی قوت اور اپنی جان کے احساس نے جینے کا نیا حوصلہ دیا، قتل و غارت اور فسادات کے ہاتھوں، جسم و جاں کے زیاں اور گھر سے بے گھر ہو جانے کے شدید احساس کے باوجود قوم کے حساس افراد کی حیثیت سے، ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے بھی اس کا اظہار بڑے رجائی انداز میں کیا لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد ہمارے یہاں جمہوریت نے ایسی افراتفری، بدنظمی، طبقاتی کشمکش اور جبر و استحصال کی صورت اختیار کر لی کہ اجنبی ہاتھوں کی گرانباری کو بھی مات کر گئی۔ مجبوراً ہمارے شاعر کو بھی کہنا پڑا کہ ع

یہ صبحِ نو ہے تو اس صبحِ نو کو میرا سلام

یہ آواز کسی ایک شاعر کی نہیں بلکہ جس دور کا ذکر ہے اس دور کے بیشتر شاعروں کی آواز ہے۔

طوالت کے خوف سے مثالیں مناسب نہ ہوں گی، ورنہ اپنوں کے ہاتھوں آزادی کا گلا جس طرح گھونٹا گیا، اس کے خلاف اس طرح کا احتجاجی رویہ، کم وبیش ہر اس شاعر کے یہاں نظر آتا ہے جو ذرا سا بھی سماجی شعور رکھتا ہے۔ مانا کہ یہ احتجاج ان لوگوں کے یہاں بے دلی و مایوسی یا خوف زدگی و شکست خوردگی کی علامت بن کر نہیں بلکہ ایک طرح کے رجائی اور حوصلہ مندانہ لہجے میں نمودار ہوا ہے اور اس حوصلہ مندی اور رجائیت کو ایک خوبصورت آدرش کا نام بھی دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی زندگی کے حق میں یہ آدرش کارگر ثابت نہ ہوا۔ اور آخر آخر میں تو سربلندی کی اس سعیٔ رائیگاں کو اپنی شکست کا اعتراف اس طرح کرنا پڑا کہ

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے
تو لوٹ آئے ترے سر بلند کیا کرتے

شعر بہت خوبصورت ہے اور مانا کہ عظمتِ عشق کا بیان اس شعر میں بڑے دلکش اور اچھوتے انداز میں کیا گیا ہے لیکن اتنی بات بہت واضح ہے کہ لوٹ آنے کا ٹھکانہ شاعر کے پاس بہر حال موجود ہے اور واپسی کا راستہ کھلا ہوا ہے، یہ بات صرف وہی شاعر کہہ سکتا ہے جسے کوئی نہ کوئی راہ فرار نظر آ رہی ہو، جس کے آگے پیچھے، دائیں بائیں کوئی راستہ ہو، ماضی کی کوئی گزرگاہ، روایت کی کوئی پگڈنڈی، اسلاف کی دی ہوئی کوئی پناہ گاہ اور بزرگوں کی عطا کردہ کوئی خانقاہ ہو۔ لیکن جس کے پاس ان میں سے کچھ نہ ہو، وہ دار و رسن کے مرحلے سے لوٹنے کی ہمت بھی کرے تو کہاں جائے اور پناہ کہاں تلاش کرے۔ یہ وہ اہم سوال ہے جو نئی نسل اپنے بزرگوں سے بار بار پوچھتی ہے، اور پوچھتی رہے گی۔ چنانچہ پوری دیانت داری کے ساتھ اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ نئی نسل کو ورثے میں کیا ملا ہے۔ اس کے ماحول اور اس کے بزرگوں نے دکھ، درد، لوٹ کھسوٹ، غربت و افلاس، عیاری و مکاری، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی،

محرومی، مایوسی، خود پرستی، طبقاتی کشمکش، نفسیاتی الجھن، ذہنی انتشار، نفرت، عصبیت، تنگ نظری، رجعت پسندی، ہارٹ اٹیک، بلڈ پریشر، سیاسی بازیگری، مذہبی اجارہ داری، بھوک، بیماری، احساس کے زخم، سوچ کے ناسور، موت کے سائے، مجمعے کے عذاب اور تنہائی کے خوف کے سوا نئی نسل کو کیا دیا ہے۔

اشفاق حسین نے اپنی ایک نظم میں اس مخصوص طرز حیات کا بڑا خوبصورت اظہار کیا ہے

ہوا دریدہ بدن، راستے شکستہ لباس
گزرتے لمحوں کا آہنگ، بیتی شام کی چاپ
نظر اٹھا کے جو دیکھوں تو دور دور تلک
بلند ہوتی ہی جائے فصیلِ تنہائی
نہ یادِ یار کی قندیل ہے نہ ہجر کا چاند
بس ایک دل کے دھڑکنے کی بے صدا آواز
میں ایسے لمحوں کی دہلیز پر کھڑا ہو کر
یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنی شمعِ جسم کے ساتھ
مرے خیال کے آنگن میں آ کے رقص کرو
مجھے نہ ہونے کا احساس کھائے جاتا ہے
مرے وجود کو احساسِ زندگی دے دو
تم اپنے قربِ تخیل کی چاندنی دے دو

(بے صدا آواز)

نئی نسل کو اپنی پیدائش سے لے کر سن شعور تک یعنی پچھلے تیس سال میں فی الواقع عذابوں کے سوا

اگر اور کچھ نہیں ملا تو پھر نئی نسل اپنے ماحول، اپنے ماضی، اپنے عہد اور اس کی تہذیبی اقدار و روایات، سب سے بغاوت کرنے، ان سے نجات پا لینے اور انھیں توڑ پھوڑ کر رکھ دینے میں حق بجانب ہے۔ نئی نسل کے ادیبوں اور شاعروں نے یقیناً آزاد مملکت میں آنکھ کھولی تھی۔ آزادی کے ماحول ہی میں پلے بڑھے اور پروان چڑھے لیکن جب یہ آزادی نام نہاد ثابت ہوئی تو ان کی افتادِ طبع، ان سے حقیقی آزادی کی طالب ہوئی، ایسی آزادی جس میں کم از کم ایک لمحے کے لئے انھیں اپنے طور پر سوچنے، محسوس کرنے، اظہار خیال کرنے اور جینے کی آزادی حاصل ہو۔ اب اس طلب آزادی کو چاہے بغاوت کا نام دیا جائے، خواہ جرم و نفرت سے تعبیر کیا جائے، نئی نسل بہر حال اس کی مرتکب ہوئی ہے۔ اس ارتکاب و اقرار جرم کے لئے خواہ کتنی ہی بڑی سزا کیوں نہ تجویز کی جائے، نئی نسل اس سے خوف زدہ نہیں کہ وہ خوف کی چہار دیواری ہی میں پروان چڑھی ہے۔ اس کے تیور اب کچھ اور ہیں۔ وہ کسی خوش لباس آدرش یا مشورے کے فریب میں آنے کو تیار نہیں۔ بلکہ وہ مشورہ دینے والوں کی سادہ لوحی کو طنز کا نشانہ بناتے ہوئے اشفاق حسین کے لفظوں میں اپنے عزائم کا اعلان اپنے طور پر کر دیتی ہے

تم سمجھتے ہو
آنکھوں پہ اک سبز عینک لگا کر
یہ بے سبزہ میدان
سرسبز و شاداب بن جائیں گے
یہ بے آس فصلیں
خزاں کا لباس
اپنے جسموں سے یوں نوچ لیں گی

کہ جیسے کوئی سوکھا پتہ
ہواؤں کے بے رحم جھونکوں کے ہاتھوں
وجود اپنا کھو بیٹھتا ہے
تم سمجھتے ہو
بس اک تمھارے لبوں کی ہنسی کے سبب
یہ ماحول کی تلخیاں
خود بخود ہو کے تحلیل مر جائیں گی
یہ تو ممکن نہیں
کیوں نہ ہم اپنے ماحول کے
تھرتھراتے لبوں سے
یہ بے چارگی چھین لیں
ایک بوسیدہ دیوار کی اوٹ میں
چھپ گئی ہے جو یہ چاندنی چھین لیں
روشنی چھین لیں
زندگی حق ہمارا ہے
،ہم
موت سے زندگی چھین لیں

(مشورہ)

لیکن اس جرم کی پاداش میں نئی نسل کے شاعروں کو کوڑے لگانے سے پہلے محتسبوں کو یہ ضرور سوچنا چاہئے کہ یہ جرم انھوں نے اپنی رضا و رغبت سے کیا ہے، یا ایسا کرنے پر وہ مجبور کئے گئے ہیں۔ یہ نکتہ اگر سمجھ میں آ جائے تو نئی نسل کے ذہنی رویہ اور طرزِ احساس کے ساتھ رفاقت و ہم آہنگی کچھ اتنی مشکل نہیں رہ جائے گی۔

اشفاق حسین اور ان کی شاعری کی عمر زیادہ نہ سہی لیکن یہ حوصلہ اور خود اعتمادی کیا کم ہے کہ انھوں نے اپنے مجموعۂ کلام کو ''اعتبار'' کا نام دیا ہے۔ اعتبار میں ان کی وہ نظمیں اور غزلیں بھی شامل ہیں جو ان کے طالبِ علمی کے زمانے کی یادگار ہیں اور وہ بھی جو انھوں نے عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد سے لے کر ''اعتبار'' کی طباعت و اشاعت سے چند روز پہلے تک کہی ہیں۔ اس لحاظ سے ''اعتبار'' اشفاق حسین کی اب تک کی ساری تخلیقی کاوشوں کا انتخاب اور مجموعہ کلام ہے۔

اس مجموعہ میں کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں اگر مجھے اشفاق کی عمر، ان کے تجربے، ان کے مزاج، ان کی نرگسیت، ان کے ایج گروپ کی نفسیات، ان کے گرد و پیش کی زندگی اور خود اپنے مطالعے کو سامنے رکھ کر کچھ کہنا پڑے تو میرؔ کے لفظوں میں کہوں گا کہ

یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہے، بات یہ ہے کہ عام طور پر کسی نوجوان شاعر سے اس کے رومانی تجربوں اور جذبوں کے سوا، مسائلِ حیات پر سوچنے اور احساس کی سطح پر ان سے الجھنے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ نوجوان شاعر اگر جنسی خواہشوں اور رومانی لگاوٹوں کو ہی اپنی شخصیت کی مدد سے نفسِ سرکش کی تادیب اور جمالیاتی حسن کی تسکین کا سامان بہم پہنچا سکے تو اسی کو اس کا کمالِ فن سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ زندگی کے اہم پہلوؤں کو دائمی تجربات میں لانے کا سوال اسی وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ شاعر، شباب کی جذباتی اور

ہیجانی دنیا سے گزر کر سنجیدہ اور متین افکار کی حدود میں داخل ہو گیا ہو اور اس میں زندگی کے حقائق کو فنی تجربے میں لانے کا شعور پختہ ہو گیا ہو لیکن میں اشفاق کے شعری مجموعے ''اعتبار'' کے مطالعے سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس میں اقتضائے شباب کی رومان پرور فضا کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ یعنی اشفاق نے ابتدائی دور کی غزلوں میں بھی بعض ایسے اشعار نکال لئے ہیں جو لطف لینے کے ساتھ ساتھ سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں اور شاعر کی اٹھان اور اس کے روشن امکان کا سراغ بھی دیتے ہیں۔ دو چار شعر دیکھئے

یہ جانتا تو کبھی بھول کر نہ ملتا میں
کہ وہ ملے گا تو اتنا بدل چکا ہوگا

آسان تو نہیں ہے کہ اس کو بھلا سکوں
لیکن اتر بھی جاتے ہیں دریا چڑھے ہوئے

میں اور آپ کو الزامِ بے وفائی دوں
بہت برا ہوں مگر اس قدر برا بھی نہیں

پلکوں پہ رکے ہوئے یہ آنسو
آنکھوں کا عذاب ہو گئے ہیں

ویرانیٔ نگاہ اب اس انتہا پہ ہے
تیری ہنسی بھی جس کا مداوا نہ کر سکے

غزل کے ان خوبصورت اشعار سے قطع نظر ''اعتبار'' میں جو چیز خاص طور پر قابلِ ذکر ہے اور میری توجہ کا باعث بنی وہ اپنے عہد کے ایک ایک لمحے اور ایک ایک تہذیبی سائے کو فنی گرفت میں لینے کی کوشش ہے۔ ہمارے عہد کے بیشتر شاعروں کا المیہ یہ ہے کہ ان کی شاعری اپنے عہد سے کوئی واضح اور استوار ناطہ نہیں رکھتی۔ بعض شاعر تو زبان و بیان اور طرزِ احساس ہر لحاظ سے دو دو سو سال پہلے کی مخلوق معلوم ہوتے ہیں اور ان کی شاعری بیسویں صدی میں اٹھارہویں صدی کی یاد دلاتی ہے۔ کچھ شاعر ایسے بھی ہیں جو لانگ رینج میں سوچنے اور دور تک دیکھنے کی صلاحیت نہ رکھنے کے باوجود محض جدید شاعر کہلانے کے شوق میں دور کی کوڑی لانے کی کوشش کرتے ہیں اور چونکہ یہ کوڑی معنوی اعتبار سے دو کوڑی کی بھی نہیں ہوتی اس لئے مضحکہ خیزی کا باعث بن جاتے ہیں۔ اشفاق کا مجموعۂ کلام ان کمزوریوں سے پاک ہے، ان کی شاعری کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک خیال اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ان کی شاعری اسی عہد سے تعلق رکھتی ہے جو ان کا اپنا عہد ہے جس میں انھوں نے آنکھ کھولی، پروان چڑھے اور شعور کو پہنچے ہیں۔ اسی سرزمین کی کہانی ہے جس کی آب و ہوا، مٹی اور باغ و زاغ سے ان کے دل و دماغ نے جلا پائی ہے۔ تہذیبی زندگی کی اسی شکست و ریخت اور سیاسی و سماجی زندگی کی اس گھٹن کی آئینہ دار ہے جس میں شاعر سانس لے رہا ہے، جی رہا ہے اور جو اس عہد کا مقدر معلوم ہوتا ہے۔ اس کی شاعری اسی طرز احساس اور سوچ کی ترجمان ہے جو اس کی زندگی نے ردِّ عمل کے طور پر اسے بخشی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اشفاق حسین کا دور اور ان کی شاعری لفظ و بیان اور فکر و احساس کی ہر سطح پر ایک دوسرے سے اس طرح ہم آہنگ ہیں کہ ایک کی معرفت دوسرے کو ہم بڑی آسانی سے پہچان سکتے ہیں۔ ایک غزل کے

پانچ شعر دیکھئے

یوں غم سے ہم نڈھال تو پہلے کبھی نہ تھے
ایسے شکستہ حال تو پہلے کبھی نہ تھے
کیوں جی رہے ہیں کس کے لئے جی رہے ہیں ہم
یہ ذہن میں سوال تو پہلے کبھی نہ تھے
عرصہ ہوا کہ یاد بھی تیری نہ آ سکی
ہم اتنے بے خیال تو پہلے کبھی نہ تھے
یکسانیت پہ زیست کی حیران ہیں کہ ہم
پابندِ ماہ و سال تو پہلے کبھی نہ تھے
ہم سوچ کے نگر میں کہاں تک نکل گئے
گم گشتۂ خیال تو پہلے کبھی نہ تھے

ان اشعار میں جس دور کی حسیت کام کر رہی ہے اسے شناخت کر لینا ایک باشعور قاری کے لئے مشکل نہیں ہے لیکن یہ حسّیت ،غزلوں کی بہ نسبت اشفاق کی نظموں میں زیادہ نمودار ہوئی ہے اور ایسی آب و تاب اور دلآویزی کے ساتھ کہ میں اس کی تفصیل میں جانے سے پہلے، آپ سے کم از کم ''اعتبار'' کی چند نظمیں خصوصاً 'میں تنہا نہیں ہوں'، 'بے صدا آواز'، 'وہ دن آنے والا ہے'، 'کل کسی وقت بھی''، 'نسلوں کے عذاب' اور 'اندیشے' کے مطالعے کی سفارش کروں گا۔

جامعہ کراچی ، ۱۴/اگست ۱۹۷۹ء

(ڈاکٹر فرمان فتح پوری' اعتبار کیا مشمولہ 'اعتبار' ص ۹-۲۰ کونسل آف آرٹس اینڈ کلچر' کراچی ۱۹۷۹ء)